© rasailojaraid.com

بین الاقوامی تعلقات کا اسلامی قانون: بنیادیں اور آج کی دنیا سے تعلق

بین الاقوامی قانون کی بنیادیں

انسانی معاشروں خصوصاً بادشاہوں اور بادشاہتوں کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کی ضابطہ بندی بالکل ابتداء ہی سے مشکل کام رہا ہے۔ زمانۂ قدیم سے قانون داں اور فلسفی ایسے قانونی اور اخلاقی اصول مرتب کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں جو انصاف اور پاکبازی کے اصولوں کے مطابق طاقت کے استعمال پر قابو رکھنے اور حکمرانوں اور ریاستوں کے درمیان تعلقات کی ضابطہ بندی کرنے میں مؤثر ہوسکیں۔ ان اصولوں کے علمبرداروں کے لیے ایک بڑا چیلنج ایسی معقول و منطقی بنیاد کو واضح کرنا تھا جس پر یہ قوانین تشکیل دیے جاسکیں۔ مؤرخین کے ریکارڈ کے مطابق اس ضمن میں کی گئی اولین کوششوں میں بین الاقوامی قانون کی یہ بنیاد قدیم مذاہب کے صحیفوں سے اخذ کی گئی تھی جن میں طاقت کے غلط استعمال پر بکثرت زجر و توبیخ کی گئی ہے۔ تاہم یہ اخلاقی پند و نصائح کسی قانونی نظم وضبط یا بین الاقوامی فلسفہ قانون کی بنیاد نہیں بن سکتے۔

مغربی ماہرین قانون کی جانب سے قابل عمل اور منطقی بین الاقوامی قانون کو پروان چڑھانے کے لیے کی جانے والی کوششوں میں زیر بحث لائی گئی قدیم ترین بنیاد فطری قانون کا نظریہ تھا۔ اس نظریے نے – جو بین الاقوامی قانون کے لیے خدا، فطرت، آفاقی منطق اور خالص منطق کے ممکنہ بنیادیں اور ذرائع ہونے پر مبنی تھا – کئی صدیوں تک مغربی ماہرین قانون کو مشغول رکھا۔

یہ ''ذرائع'' قانون کو پیدا کرنے والے یا ایسے بنیادی ذرائع قرار دیے گئے جن سے تمام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوانین اخذ کیے جانے چاہئیں۔ یہ قانون اُس چیز کی بنیاد پر متعین کیا جا سکتا تھا جسے درست دلیل اور سبب باور کیا جائے۔ اس طرح فطری قانون کے نظریے نے فرض کیا کہ بین الاقوامی قانون کی حتمی بنیاد کا آخری ذریعہ مابعد الطبیعاتی ہے۔

تاہم فطری قانون اپنی فلسفیانہ وعلمی قدر و قیمت کے باوجود، بین الاقوامی مرتبے کے ایک متفقہ آفاقی قانون کو پروان چڑھانے میں ناکام رہا۔ اس کی ناکامی نے مثبت قانون کے نظریے کی راہ ہموار کی جو ریاستوں اور حکمرانوں کے حقیقی رویوں پر مبنی تھا۔ صرف قانون ہی نہیں بلکہ پوری اجتماعی زندگی کو مذاہب اور روحانی پوشاک سے الگ کر دینے کی انتھک کوششوں کے ساتھ یہ طرز فکر مغرب میں سیکولرازم کے ابھرتے ہوئے رجحان سے زیادہ مطابقت رکھتا تھا۔ مثبت قانون کا نظریہ اقدار سے آزاد تھا چنانچہ اس نے قانون کے اصولی و معیاری مفاہیم اور دوسرے سماجی ضابطوں کو مسترد کر دیا۔ اس نے خدا، اخلاقیات اور دلیل و معقولیت جیسی قانون کی کسی غیر ریاستی اساس کو قبول کرنے سے بھی انکار کیا۔[۱]

ان علمی کاوشوں کے باوجود، مثبت قانون کے نظریے کے بیشتر علم بردار ایسے قانون کو پروان چڑھانے کے معاملے میں انسانی صلاحیت سے مایوس اور غیر مطمئن نظر آئے۔ ایک قدیم رومن حکمراں کا قول ہے کہ ہتھیاروں کی معیت میں قوانین ناکام ہو جاتے ہیں یا کم از کم خاموش رہتے ہیں۔ تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ ہتھیاروں کے کھیل کے دوران قوانین یا تو ناکام ہو جاتے ہیں یا منظر سے ہٹ جانے کی راہ اپناتے ہیں۔ اس رومن حکمراں نے بہت پہلے اس حقیقت کی نشان دہی کر دی تھی کہ ماضی میں ریاستوں کے مابین تعلقات کو منضبط کرنے اور طاقت کے استعمال سے بچنے کے لیے مختلف معاشروں اور تہذیبوں کی جانب سے کیے گئے تجربات بری طرح ناکام ہوتے رہے ہیں۔ ان ناکامیوں اور ان سے نمٹنے میں درپیش مشکلات کے باوجود، انسانی تعلقات کو منضبط کرنے کے لیے کی جانے والی کوششیں، خصوصاً جنگ جیسے حالات میں، شاید اتنی ہی پرانی ہیں جتنا خود انسانی معاشرہ۔

تاریخ کے ریکارڈ کے مطابق ایسی پہلی کاوش میسوپوٹیمیا میں لگ بھگ دو ہزار قبل مسیح میں کی گئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی۔اس کی کچھ تفصیلات ہم تک پہنچی ہیں۔ یہ علاقے کی دو بڑی طاقتوں کے درمیان ہونے والا ایک سمجھوتہ تھا جس میں باہمی طور پر طے کیا گیا تھا کہ سرحدی قضیوں اور دوسرے باہمی اور دوطرفہ مسائل کو بات چیت اور پرامن ذرائع سے حل کیا جائے گا۔اس دستاویز کو بجا طور پر بین الاقوامی تنازعات کے حل کے نقطہ نظر سے کیا گیا قدیم ترین سمجھوتہ یا معاہدہ تصور کیا جاسکتا ہے۔
اس ضمن میں ہندی اور چینی فلسفیوں اور مفکرین کی کاوشیں بھی اہم ہیں۔ انہوں نے ایسے قوانین اور اصول وضع کرنے کی کوششیں کیں جو بین الاقوامی تعلقات کو منضبط کرنے کی بنیاد بن سکیں۔[۲]

ان نسبتاً ترقی یافتہ معاشروں کے ساتھ ساتھ، زمانہ قدیم میں، خودمختار بادشاہوں اور عوام کے درمیان تعلقات کو منضبط کرنے کے طریق کار کے قواعد موجود تھے جو ان کے اپنے استعمال اور تجربات سے وجود میں آئے تھے۔ عیسائیت کے آغاز سے صدیوں پہلے مصری ایسے متعین قواعد وضوابط سے واقف تھے[۳]۔

ان منتشر مثالوں کے علاوہ، مشرق اور مغرب دونوں میں، یونانیوں اور رومیوں کی جانب سے ایسے قانون کی تیاری کی کوششیں کی گئیں جو مسلح تنازع کے دوران طاقت کے استعمال کو منضبط کرسکے۔ مثلاً رومیوں نے اس مقصد کے لیے جو قانون بنایا وہ Jus Gentium یعنی عوام کا قانون کہلاتا تھا۔[۴] دوسرے معاشروں میں بھی باہمی تنازعات اور اختلافات کے تصفیہ کی بنیاد فراہم کرنے کے لیے ایسے ہی قوانین موجود تھے۔

مغرب میں جدید بین الاقوامی قانون کا ارتقاء

سترھویں صدی کے قریب، مغربی تہذیب بالآخر ایسے قانون کی بنیاد ڈالنے کے قابل ہوگئی جسے فی الواقع بین الاقوامی قانون کے طور پر جانا جاسکے۔ بین الاقوامی قانون کی اس اساس میں رسوم و رواج، معاہدوں، اور عملاً بین الاقوامی اداروں کی طرف سے قانون سازی کی ایسی ہی کوششوں کی وجہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے تیز رفتار تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اس پیش رفت پر کوئی تفصیلی بحث اصل موضوع سے ہماری توجہ ہٹا دے گی۔ تاہم یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ جدید بین الاقوامی قانون کا مقصد ابتداً یورپ کی عیسائی ریاستوں کے باہمی تعلقات کو منضبط کرنا تھا، اور یہ قومیں صرف اپنے باہمی تعلقات میں خود کو اس کا مکلّف سمجھتی تھیں۔ غیر عیسائی ایک مدت تک اس قانون کے تحت کسی فائدے یا مراعات کے مستحق تصور نہیں کیے جاتے تھے۔ اس لیے بین الاقوامی قانون مغرب میں جس طرح پروان چڑھا، وہ اپنی تعریف کی رو سے، ایک عیسائی قانون ہے۔ فی الحقیقت یہ تعریف بین الاقوامی قانون کی کئی معیاری نصابی کتابوں میں دی گئی ہے۔ ان میں پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے تعلیمی اداروں سمیت عالمی سطح پر تقریباً تمام ایسی ممتاز جامعات اور لاء اسکولوں میں جہاں اینگلوسیکسن قانونی روایت کی تدریس ہوتی ہے، پڑھائی جانے والی اوپن ہیم ۵ کی شاہکار تصنیف بھی شامل ہے۔

بین الاقوامی قانون کے اس پہلو کی مختلف لوگوں نے مختلف طور پر تعبیر کی ہے۔ زیادہ متشدد نقطہ ہائے نظر میں، پوپ کی جانب سے مختلف اوقات میں جاری کیے جانے والے کم از کم دو فرامین شامل ہیں جن میں قرار دیا گیا تھا کہ عیسائی دنیا کو مذہباً کسی مسلم ملک کے ساتھ کسی پرامن معاہدے میں شامل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ ۶ پوپ نکولس چہارم اور پوپ اربن ششم نے اعلان کیا تھا کہ کسی غیر عیسائی ریاست کے ساتھ کیا گیا ہر معاہدہ لغو اور باطل ہے اور عیسائی، مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے کسی معاہدے کے پابند نہیں ہیں۔ ۷ جب پوپ صاحبان نے یہ حکم جاری کیا تو غالباً ان کے دماغ میں سلطنت عثمانیہ کا خیال تھا۔ یہ ۱۸۵۶ء کا ترکی تھا جسے یورپ کے بین الاقوامی قانون کی تاریخ میں پہلی بار متعلقہ مراعات سے استفادے کے حق کے ساتھ بین الاقوامی برادری کا رکن تسلیم کیا گیا۔ ترکی کے بعد جاپان کو ۱۹۰۵ء میں یہ مرتبہ دیا گیا۔ مغربی بین الاقوامی قانون کئی عبوری ادوار سے گزرا ہے۔ یورپی اقوام اور ممالک ابتداء میں صرف اپنے اپنے براعظموں میں اپنی مذہبی روایت کے مطابق تعلقات کو منضبط کرنے سے سروکار رکھتے تھے۔ مغرب میں اس وقت تک اس قانون کو دوسری تہذیبوں اور ملکوں تک وسیع کرنے کا عمل شروع نہیں ہوا تھا۔ جب اس قانون کا دائرہ اطلاق وسیع ہو گیا تو یورپ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے سابقہ رویے میں یقینی طور پر زیادہ معروضیت اور توازن پیدا ہوا۔ تاہم یہ بات مانی جانی چاہیے کہ اس پرانے رویے کے اثرات ان میں سے بعض عناصر کی سوچ میں اب بھی پیوست ہیں جو آج بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی امور سے متعلق معاملات طے کرتے ہیں۔ یہ رویہ مسلمانوں کو اذیت دیتا ہے جو اکثر اس کے ہاتھوں زخم کھاتے ہیں۔ اس رویے کے نتیجے میں انہیں وہ حقوق اور مراعات پوری طرح دینے سے انکار کیا جاتا ہے جن کی ضمانت انہیں بین الاقوامی قانون کے مختلف پہلوؤں کے تحت دی گئی ہے۔ اس طرح انہیں یہ سمجھنے پر مجبور کیا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ اب بھی بین الاقوامی برادری کے مساوی رکن کا سا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ مغرب میں بین الاقوامی قانون جس طرح پروان چڑھا، یہ کیفیت اس کا فطری نتیجہ ہے۔

مغربی بین الاقوامی قانون کو مختلف ملکوں کے بلدیاتی قانون سے کچھ مختلف چیز سمجھا گیا۔ چنانچہ ایک مدت تک یہ صرف ریاستوں سے معاملات تک محدود رہا۔ بین الاقوامی تنظیموں اور بین الاقوامی اداروں کو بین الاقوامی قانون کا موضوع تسلیم کیے جانے کا مرحلہ بہت دیر بعد بیسویں صدی کے وسط میں آیا۔

بین الاقوامی قانون کے تحت افراد کے ان گروپوں اور جماعتوں کی جانب متوجہ ہونے کی نوبت اور بھی بعد میں آئی جو کسی ریاست کی نمائندگی نہیں کرتیں یا جنہیں کسی ریاست کی جانب سے نمائندگی نہیں دی گئی تھی۔۸ فی الحقیقت افراد اور جماعتوں کے معاملے کا بین الاقوامی قانون کا موضوع تسلیم کیا جانا بہت تازہ بات ہے جسے شاید تین عشروں سے زیادہ نہیں ہوئے۔ باغی، جنگجو اور ایسے ہی دیگر عناصر جو کسی ملک کی اصل آبادی سے الگ ظاہر ہو سکتے ہیں، ابتداء میں بین الاقوامی قانون کا موضوع تصور نہیں کیے جاتے تھے۹۔ تاہم اب وہ ایک اہم موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح قومی آزادی کی تحریکوں کو بھی بین الاقوامی قانون کی دلچسپی کا موضوع سمجھے جانے میں ایک لمبی مدت لگی۔ آزادی کی تحریکوں کی اقوام متحدہ کی کسی رکن ریاست کی جانب سے نمائندگی نہیں کی جاتی تھی۔ اس لیے نہ تو انہیں زیر غور لانے کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی، نہ بین الاقوامی قانون کا خود اپنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈھانچہ نہیں، ایک موضوع کی حیثیت سے، کوئی حقوق یا مراعات فراہم کرنے کے قابل تھا۔[10]

بیسویں صدی کے دوسرے نصف نے بین الاقوامی قانون اور مغربی دنیا کی قانون سے متعلق سوچ میں ایک بڑی تبدیلی دیکھی۔ دوسری عالمی جنگ کے خوفناک تجربے نے عالمی برادری کو اس نتیجے پر پہنچایا کہ مسلح تنازعات سے متاثر ہونے والے معصوم شہریوں کے مفادات اور دفاع کو محفوظ بنانے کے لیے بین الاقوامی قانون کی نئی جہتیں تلاش کی جانی چاہئیں۔ پچھلے چند عشروں پر مشتمل اس دور نے سائنس اور بین الاقوامی قانون میں توسیع اور تعمق کا غیر معمولی عمل دیکھا جس نے نئے میدانوں اور نئے موضوعات کو بین الاقوامی قانون میں داخل کیا۔ ان میں سے بیشتر پیش رفت کا تذکرہ، بین الاقوامی قانون پر کی گئی کلاسیکی کاوشوں میں نہیں ملتا۔

بین الاقوامی قانون کے نئے شعبوں میں سے چند یہ ہیں: خلاء کے معاملات کی ضابطہ کاری، گہرے پانیوں کے ٹھکانوں کا استعمال اور تقسیم، بین الاقوامی مالیاتی نظام کا بندوبست اور بین الاقوامی مواصلات۔ لیکن بین الاقوامی قانون سازی کا علم قانون میں اپنی جگہ بنانے والا سب سے اہم شعبہ، جو اپنے فوائد کو لوگوں کی بہت بڑی تعداد تک پہلے ہی وسعت دے چکا ہے، انسانی حقوق کا بین الاقوامی قانون ہے۔

انسانی حقوق کا موضوع بیسویں صدی کے آغاز تک دنیا کے بہت سے دساتیر میں شامل نہیں تھا۔ تاہم بہت مدت پہلے ایک وقت آیا جب انسانی حقوق کے سوال نے قانونی سوچ کے تناظر، بالخصوص دستوری قانون کے میدان میں اولین اہمیت حاصل کر لی۔ جلد ہی اس کی تقلید بین الاقوامی قانون میں بھی ایسی ہی پیش رفت کے ذریعے کی گئی۔

یہ بات لازماً تسلیم کی جانی چاہیے کہ ان اختراعی اور مثبت تبدیلیوں کا سہرا مغربی روایت کے سر ہے، جس نے اپنے شہریوں کو دستوری ضمانتیں مہیا کرنے میں پیش قدمی کی۔ یہ اعتراف بھی کیا جانا چاہیے کہ بنیادی حقوق کا سوال، قانون کی حکمرانی کا تصور، آئینی ذرائع پر مبنی بنیادی حقوق کے دفاع کا نظام، اور شہریوں کے حقوق کے دفاع و تحفظ کے لیے ایک اعلیٰ ترین عدالت کی موجودگی کا خیال، ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر جس طرح بعض جدید مسلم ملکوں میں عمل ہو رہا ہے، وہ، مغرب خصوصاً امریکی تجربے کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے امریکی مصنفوں نے فخر کے ساتھ اور بجا طور پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ امریکی آئینی روایات اور اصول، امریکہ کی اہم ترین برآمد ہیں۔ بیس سال پہلے تک امریکی اس دعوے میں حق بجانب تھے۔ تاہم بدقسمتی سے پچھلی ربع صدی میں امریکہ کی پالیسیاں، بالخصوص جن کا تعلق مسلم دنیا سے ہے، ایسی رہی ہیں کہ امریکی یہ دعویٰ کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہے۔

بین الاقوامی قانون کے بعض مغربی فضلاء بین الاقوامی قانون کے دائرے میں انسانی حقوق کی شمولیت کو بہت بڑا کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ مارٹن ڈکسن اسے ایک قابل لحاظ کامیابی تصور کرتے ہیں کہ اب فرد بھی بین الاقوامی قانون کے دائرہ اختیار میں شمار کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ اس صورت میں بھی جب اس اعتراف کا کوئی اثر عملی طور پر نظر نہ آتا ہو۔[11]

انسانی حقوق کے باب میں یہ ایک نیا رجحان ہے جس کے سبب یہ بین الاقوامی قانون کا اہم ترین نہیں تو ایک نہایت اہم جزو ضرور بن گیا ہے[12]۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے کی تحریری کاوشوں میں انسانی حقوق کا مشکل ہی سے کوئی ذکر ملتا ہے۔ اس دور کی کتابوں میں نہ صرف یہ کہ اس معاملے کا کوئی تذکرہ نہیں پایا جاتا بلکہ بیسویں صدی کے وسط سے پہلے تک بین الاقوامی قانون سے متعلق ادارے بھی فرد کے انسانی حقوق کی پامالی پر کوئی توجہ دینے سے انکار کیا کرتے تھے۔ مثلاً ۱۹۲۷ء میں بخوبی معروف لوٹس کیس میں بین الاقوامی انصاف کی مستقل عدالت نے فیصلہ سنایا تھا کہ ''بین الاقوامی قانون خود مختار ریاستوں کے روابط سے متعلق ہے۔''[13]

دوسری عالمی جنگ کے خوفناک تجربے کے نتائج و عواقب کی بناء پر اس سوچ میں تبدیلی آئی اور اس نے لوگوں کو، انسانی حقوق کے معاملے کو بین الاقوامی قانون کی ایک اہم شاخ کی حیثیت دینے کی راہ دکھائی۔ اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی اداروں نے بین الاقوامی علم قانون کو یہ نئی سمت دینے میں زبردست کردار ادا کیا۔ آج انسانی حقوق کا سوال بین الاقوامی تعلقات میں ایک اہم عنصر سمجھا جاتا ہے۔ متعدد مغربی ملکوں نے انسانی حقوق کی حمایت، تحفظ اور دفاع کے مقصد کو اپنی خارجہ پالیسی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بین الاقوامی تعلقات کے سنگ بنیاد کی حیثیت سے اختیار کیا ہے۔

یہاں اس بات کی نشان دہی مناسب ہوگی کہ مغربی دنیا میں جو کچھ دو عالمی جنگوں کے خوفناک تجربات کے بعد حاصل کیا گیا۔ یعنی افراد اور غیر ریاستی عناصر کے بین الاقوامی قانون کا موضوع ہونے کو تسلیم کیا جانا، اور ان لوگوں کے بنیادی انسانی حقوق کا لحاظ جو جنگوں سے متاثر ہوئے ہوں۔ وہ مسلم بین الاقوامی قانون کا بالکل ابتداء ہی سے ایک اہم موضوع رہا تھا۔ اس کی وضاحت اس مقالے کے دوسرے حصے میں کی گئی ہے۔

انسانی حقوق کے قانون کا ایک کلیدی ماخذ بین الاقوامی سمجھوتے ہیں۔ تاہم اب بالعموم تسلیم کیا جاتا ہے کہ بین الاقوامی تعلقات کا قانون، خصوصاً جہاں تک وہ انسانی حقوق سے متعلق ہے، اس کی اصل بنیاد ریاست کی معاہداتی ذمہ داریوں پر ہے۔ بہرکیف بین الاقوامی معاہدے اور ریاست کی معاہداتی ذمہ داریاں صرف رسمی ماخذ ہیں۔ اور کسی بھی طرح بین الاقوامی قانون کی اس شاخ کے تقدس اور اہمیت کا واحد سبب نہیں ہیں۔ فی الحقیقت سب سے پہلے یہ عدل وانصاف کے لیے لوگوں کے دل و دماغ میں پایا جانے والا تقاضا اور انسان کے وقار و احترام پر ان کا عقیدہ ہے جو ان حقوق کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اگر انسانوں کی عزت اور وقار کا احساس لوگوں کے دل و دماغ میں گہرے طور پر پیوست نہ ہوتا تو محض معاہداتی ذمہ داریاں ہرگز نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی تھیں۔ یہ حقیقت پچھلے دو عشروں کے تجربات سے بخوبی واضح ہو چکی ہے۔ فلسطین، بوسنیا اور کشمیر اور حال ہی میں گوانتانا موبے جیسے علاقوں میں انسانی حقوق کی پامالی کی مثالیں اتنی معروف ہیں کہ انہیں نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

افراد کے حقوق اور مراعات کے لیے مغربی قانون بین الاقوام اور علم قانون کی کاوشوں نے بین الاقوامی قانون کی ایک نئی شاخ کی راہ ہموار کی جو بین الاقوامی انسان دوست قانون کے طور پر معروف ہے۔ بین الاقوامی قانون کی یہ خصوصی شاخ جنگ کے دوران غیر متحارب شہریوں کے گروپوں کے انفرادی اور اجتماعی حقوق کے تحفظ کی کوشش کرتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ کسی بھی بنیاد پر ہونے والی نسل کشی اور امتیازی سلوک کو روکنے کی جدوجہد کرتی اور اقلیتوں کو خصوصی تحفظات مہیا کرتی ہے۔ ''انسانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حقوق کا قانون'' بین الاقوامی قانون کے ایک مصنف کے بقول ''تنہا بین الاقوامی قانون کی روایتی مثبت اپروچ کے حوالے سے واضح نہیں کیا جاسکتا۔''[۱۴] اس بیان کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ روایتی مغربی قانون بین الاقوام، ان اہم امور سے نمٹنے میں غیر مؤثر رہا ہے، اور اب بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی اداروں کی پہلی ترجیح انسانوں کے حقوق اور مراعات کے تحفظ کو حاصل ہونی چاہیے۔ بین الاقوامی قانون کو اب روایتی مثبت اپروچ اور اس کے محدود اور تنگ تناظر سے بالاتر ہو جانا چاہیے۔

بین الاقوامی انسان دوست قانون جو بین الاقوامی قانون کی نئی شاخ ہے۔ بین الاقوامی تنازعات میں ان لوگوں کو تحفظ فراہم کر کے جو دشمنیوں میں براہ راست شریک نہیں ہوتے یا شریک نہیں رہتے، دوسرے یہ کہ تشدد کو مقصد کے حصول کے لیے کم سے کم سطح پر رکھنے کی کوشش کر کے۔ حتی الامکان تشدد کے دائرے کو پھیلنے سے روکتا ہے۔ یہ قانون مطالبہ کرتا ہے کہ کسی بھی تنازع کا مقصد دشمن کی صرف فوجی صلاحیت کو کمزور کرنا ہونا چاہیے نہ کہ اسے مکمل اور طبعی طور پر ختم کر دینا۔

انسان دوست قانون کے بنیادی اصول یہ ہیں:

- شہریوں اور جنگجوؤں میں امتیاز،
- ان جنگجوؤں پر حملہ کرنے کی ممانعت جو شریک جنگ نہ رہیں،
- لوگوں کو غیر ضروری مشکلات میں مبتلا کرنے کی ممانعت،
- قانون ضرورت،
- قانون تناسب۔[۱۵]

ان نکات کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ انسان دوست قانون کے پانچ بنیادی اصول ہوں گے جسے مغربی دنیا میں تشکیل دیا جارہا ہے۔ یہ قانون فرض کرتا ہے کہ تنازعات سے پاک دنیا کا کوئی وجود نہیں ہے، اس لیے یہ تشدد کے مکمل خاتمے کو اپنا مقصود نہیں بناتا۔ دو قوموں یا ملکوں کے درمیان مسلح تنازع سے متاثر ہونے والوں کو مکمل تحفظ فراہم کرنے کی یہ قانون کوشش نہیں کرتا۔ یہ تنازع میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

متحارب قوتوں کے اغراض و مقاصد اور محرکات کے جائز و ناجائز ہونے کی بنیاد پر ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا اور اخلاقی اور غیر اخلاقی محرکات دونوں کی بنیاد پر جنگ کرنے والوں کو عملاً مساوی درجہ دیتا ہے۔ یہ قانون پہلے ہی سے تصور یا فرض کر لیتا ہے کہ فریقین جنگ شروع کرنے کی معقول بنیاد رکھتے ہیں۔

یہ ہے وہ علمی سیاق وسباق جس میں ہم بین الاقوامی قانون میں مسلمانوں کے کام پر بات کریں گے۔

مسلم بین الاقوامی قانون

اسلام اپنے پیغام اور طرز فکر میں بین الاقوامی ہی نہیں، آفاقی بھی ہے اور امت مسلمہ بالکل شروع ہی سے اپنا آفاقی کردار ادا کرتی رہی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اسلام کی طرف بالکل ابتداء میں دی گئی دعوت ہی میں لوگوں کے کسی مخصوص گروہ کو خطاب کرنے کے بجائے پوری انسانیت کو مخاطب کیا گیا تھا۔ قرآن، یا ارشادات نبویؐ میں ہم کہیں نہیں دیکھتے کہ خصوصی طور پر عربوں، ایرانیوں یا دوسرے نسلی یا لسانی گروہوں کو مخاطب کیا گیا ہو۔ اس کے بجائے لوگوں کو ''یا ایھا الناس'' [16] یا ''یابنی آدم'' [17] کے الفاظ سے مخاطب کیا گیا ہے۔ قرآن کی بہت سی آیات اور اہم مباحث کا آغاز ان میں سے کسی فقرے سے ہوتا ہے، خاص طور پر مکی سورتوں میں۔ اس پتہ چلتا ہے کہ بعض مغربی مصنفین کے خیال کے برعکس قرآن کا طرز فکر اور پیغام، مکے میں سلسلۂ وحی کی ابتداء ہی سے، آفاقی اور انسانی اتحاد کی دعوت پر مبنی ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں، خاص طور پر چند مغربی ذہنوں میں، ایک غلط فہمی یہ ہے کہ یہ ایک یک طرفہ نظام پیش کرتا ہے جس میں اسے نہ ماننے والوں کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جاتا۔ نیز یہ نظام اپنے دائرے سے باہر کسی تہذیبی معیار یا ثقافتی قدر کو قبول نہیں کرتا۔ یہ خیال درست نہیں۔ قرآن خود بار ہا نہایت مؤثر انداز میں دوسری قوموں کی اچھی صفات کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ [18] دوسروں کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خوبیوں کے اعتراف کی عملی مثالیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں موجود ہیں، مثلاً یہ کہ آپؐ نے فرمایا کہ حکمت و دانش پوری انسانیت کی مشترکہ میراث ہے، لہٰذا جہاں بھی یہ ملے اس سے استفادہ کیا جانا چاہیے۔[19]

یہ چیز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں بھی پوری طرح منعکس ہوئی۔ اپنی عمر کی تیسری دہائی کے اوائل میں، ایک نوجوان کی حیثیت سے، انہوں نے اپنے خاندان کے بزرگوں کے ساتھ مل کر ایک اتحاد کی بنیاد ڈالی، جس کا مقصد غریبوں کو تحفظ، زیادتی کا شکار ہونے والوں کو انصاف، بے گھر افراد کو سر چھپانے کا ٹھکانا اور کمزوروں کو امداد فراہم کرنا تھا۔ عملی طور پر یہ کوئی نسلی یا محدود اتحاد نہیں تھا بلکہ اس کے منافع، قبائلی اور دیگر امتیازات سے بالاتر اور سب کے لیے عام تھے[20]۔ اسلامی تاریخ میں یہ اتحاد حلف الفضول کے نام سے معروف ہے۔ یہ اتحاد ہجرت نبویؐ سے تین عشرے سے زیادہ مدت پہلے عمل میں آیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اعلان نبوت کے بعد لوگوں نے محسوس کیا کہ آپؐ کی تعلیمات ان اصولوں ہی جیسی ہیں جن پر یہ اتحاد قائم ہوا تھا تو انہوں نے آپؐ سے اس اتحاد کے بارے میں سوال کیا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ وہ اب بھی اس اتحاد کی خوشگوار یادوں سے محظوظ ہوتے ہیں اور اسلام کی آمد کے بعد بھی اگر انہیں ایسے کسی اتحاد میں شرکت کی دعوت دی گئی تو وہ بلا تاخیر اس پر لبیک کہیں گے۔ آپؐ نے مزید فرمایا کہ ایسے اتحاد میں شریک ہونے کو وہ سرخ اونٹوں (یعنی بدویوں کے نزدیک بہترین دنیاوی ساز و سامان) سے بہتر تصور کرتے ہیں۔[21] پیغمبر اسلام کا یہ رویہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ سچے مسلمان انسانی حقوق کے حوالے سے بین الاقوامی کوششوں میں تعاون کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔

اگر ایک منصفانہ اور روادار عالمی معاشرے کے قیام کے لیے اسلام کی نمایاں دلچسپی اور اختلاف و تنوع کے لیے اس کی جانب سے احترام کے حوالے سے کچھ شبہات باقی ہوں تو قرآن کا مطالعہ انہیں پوری طرح رفع کر دیتا ہے۔ متعدد دوسری متعلقہ آیات کے ساتھ ساتھ قرآن تمام اہل کتاب[22] کو یوں خطاب کرتا ہے: ''اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یکساں ہے، یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔'' ۲۳ یوں اس آیت میں دراصل انسانی آزادی و مساوات اور ان اخلاقی معیارات کے فروغ کے لیے باہمی تعاون کی بات کی گئی ہے جو ہمارے درمیان مشترک ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اہل کتاب کو قرآن اور مسلم دنیا نے یہ دعوت ۱۴۲۰ سال پہلے دی تھی، جبکہ اس کا جواب ابھی تک نہیں ملا ہے۔

انسانیت کی بہتری کے لیے پوری انسانی برادری کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے کی قرآن اور رسول اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے یہی حوصلہ افزائی ہے جس کی بناء پر مسلم ممالک - اقوام متحدہ، اس سے پہلے بننے والی مجلس اقوام، افریقی اتحاد کی تنظیم، اور غیر جانبدار ملکوں کی تحریک جیسے بین الاقوامی معاہدوں اور تنظیموں میں شامل ہونے میں کسی ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہوئے۔ اور اسی وجہ سے مسلم ممالک آج متعدد بین الاقوامی فورموں میں سرگرمی سے حصہ لیتے نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ مسلم ذہن مشترکہ بین الاقوامی مقاصد کو آگے بڑھانے اور بحیثیت مجموعی انسانیت کی خدمت کی خاطر دوسروں کے ساتھ تعاون کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔

اسلام نہ صرف قوموں کے تنوع کا احترام کرتا ہے بلکہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے مذہبی عقائد اور نظریات اس کے ساتھ شانہ بشانہ موجود ہیں۔ جدید مسلمان ماہرین قانون نے اس پہلو پر خصوصی توجہ دی ہے۔ ۲۴ مذاہب کی تاریخ میں شاید قرآن وہ واحد آسمانی کتاب ہے جس نے دوسرے مذاہب کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ یہ اہل کتاب، عیسائیوں، یہودیوں، صابئین، بت پرستوں اور ملحدوں سمیت سب کو مخاطب کرتا ہے۔ ۲۵ قرآن اس بارے میں مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے کہ دیگر عقائد کے ماننے والوں میں سے جو ان کے ساتھ کسی معاہدے میں شریک ہوں، جو ہر قسم کے تعلق سے دور رہنے کو ترجیح دیں، جو غیر جانبدار رہنا چاہیں، اور جو دشمنی کا رشتہ استوار کرنے کے خواہش مند ہوں، ان سے کس طرح کا برتاؤ کرنا ہے۔ ۲۶ یہ حقیقت کہ ان تمام اقسام کی وضاحت اور مسلمانوں کے لیے ان میں سے ہر ایک سے برتاؤ کے اعلیٰ اخلاقی معیارات کی صراحت، قرآن میں کی گئی ہے، ظاہر کرتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ قرآن نہ صرف یہ کہ بین الاقوامی روابط کی رنگارنگی کو ملحوظ رکھتا ہے بلکہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان باہمی میل جول اور قربت کی ممکنہ راہیں بھی تلاش کرتا ہے۔

اس ربط وضبط کی عملی تفصیلات کا مظاہرہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسوۂ حسنہ کے ذریعے کیا۔[۲۷] دوسری صدی ہجری کے مسلمان علماء اور فقہاء نے سِیَر کے نام سے قرآن اور سنت کی بنیاد پر ایک آزاد تاریخی قانونی ضابطہ مدون کیا جس میں رسول اللہ کے ان غزوات اور دیگر معرکوں سے مدد لی گئی جن میں آپ نے خود شرکت فرمائی تھی، جلد ہی سیر بین الاقوامی تعلقات کو منضبط کرنے کے والے مجموعہ قوانین کی شکل میں ڈھل گیا۔ دوسری صدی ہجری کے مسلمان فقہاء کی یہ مشق ایسی بہت سی کاوشوں کا ذریعہ بنی جن میں شریعت کے اس حصے کی ضابطہ کاری کی گئی جو غیر مسلم ہم عصروں کے ساتھ مسلمانوں کے روابط وتعلقات سے بحث کرتا ہے۔[۲۸] ان کاوشوں میں سے تقریباً ایک درجن مکمل یا جزوی طور پر ہم تک پہنچی ہیں۔[۲۹] ان میں سے تین جنہیں امام ابوحنیفہ (وفات ۱۵۰ھ) کے شاگرد امام محمد ابن حسن شیبانی (وفات ۱۸۹ھ) نے تحریر کیا، خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ شیبانی نے پہلے نسبتاً ایک مختصر کتاب لکھی جسے انہوں نے کتاب السیر الصغیر (یعنی بین الاقوامی قانون کی مختصر کتاب) کا نام دیا۔ بعد میں انہوں نے ایک زیادہ جامع کتاب تحریر کی جس کا نام انہوں نے کتاب السیر الکبیر (یعنی بین الاقوامی قانون کی بڑی کتاب) رکھا۔ اپنی زندگی کے آخری حصے میں شاید انہوں نے محسوس کیا کہ عام طالب علم کے لیے پہلی کتاب بہت مختصر اور دوسری کتاب بہت مفصل ہے، لہٰذا عام قارئین کے خیال سے ایک اور کتاب کی تیاری شروع کی۔ مگر لگتا ہے کہ یا تو وہ اس کام کو مکمل نہیں کر سکے یا وہ ہم تک پہنچا نہیں۔ اس کتاب کا ایک نامکمل مسودہ ترکی کے شہر استنبول کی سلیمانیہ لائبریری میں محفوظ ہے۔[۳۰] ہم پوری ذمہ داری سے کہہ سکتے ہیں کہ شیبانی انسانی تاریخ میں وہ پہلا ماہر قانون ہے جس نے بین الاقوامی قانون پر، دیگر قانونی افکار اور ان کی عملی کارکردگی کی دوسری شاخوں سے ممتاز اور جداگانہ موضوع کی حیثیت سے، تین ایسی کتابیں لکھیں جو آج بھی موجود ہیں۔

مغرب میں ولندیزی قانون داں ہیوگو گروشس (م ۱۶۴۵ء) کو بین الاقوامی قانون کا باوا آدم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سمجھا جاتا ہے۔ یہ پہلا مغربی قانون داں ہے جس نے ولندیزی زبان میں قانون جنگ و امن کے موضوع پر ہمارے لیے ایک کتاب چھوڑی ہے۔ تاہم اس عظیم ماہر قانون کی ولادت سے ۸۶۶ برس پہلے امام محمد ابن حسن الشیبانی عربی زبان میں سیر کے موضوع پر تین کتابیں لکھ چکے تھے جن میں انہوں نے اس حوالے سے کہ غیر مسلم اجتماعیّتوں اور ملکوں سے اسلامی ریاست کے تعلقات کس طرح منضبط کیے جانے چاہئیں، خود اپنی، اپنے استاد امام ابوحنیفہ اور دوسرے ہم عصر فقہاء کی تحقیقات اور فیصلوں کو مدوّن کیا تھا۔

دوسری صدی ہجری کے مسلمان ماہرین قانون کی جانب سے سیر کے علم کو جس طرح پروان چڑھایا گیا وہ صرف ریاستوں اور اجتماعیّتوں سے بحث نہیں کرتا بلکہ افراد کے حقوق کو بھی ملحوظ رکھتا ہے، مثلاً اس میں بتایا گیا ہے کہ غیر مسلم ماحول میں رہنے والے مسلمان اور مسلم ماحول میں بسنے والے غیر مسلم کے حقوق کیا ہیں۔ واضح رہے کہ جدید بین الاقوامی قانون نے افراد اور اجتماعیّتوں پر گزشتہ چوتھائی صدی سے پہلے تک کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ بہرکیف، شیبانی اور ان کے ہم عصر ماہرین قانون کی تحریروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے بالکل ابتداء ہی سے، افراد اور اجتماعیّتوں کو بین الاقوامی قانون کے موضوع کی حیثیت سے تسلیم کیا۔ انہوں نے دشمن ملک کے افراد کے ساتھ ساتھ ان مسلمان شہریوں کے حقوق و مراعات کی وضاحت بھی کی ہے جو دشمن کے علاقے کے دورے پر گئے ہوں۔

مارٹن ڈکسن نے پانچ اصول مقرر کیے ہیں جن کی بنیاد پر کسی بین الاقوامی قانون کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بقول بین الاقوامی قانون کا پہلا کام جنگ کو روکنا اور طاقت کے استعمال کو کنٹرول کرنا ہے۔ اگر کوئی قانون اس مقصد کے حصول میں ناکام رہے تو وہ ایک ناکام قانون ہے۔ مارٹن ڈکسن کے پانچ اصول یہ ہیں:

۱) جنگ کو روکنا،

۲) تنازع کو مفاہمت کے ذریعے پرامن طور پر طے کرنا،

۳) جنگ کو کم سے کم سطح تک محدود رکھنا،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴) جنگ کے اثرات کو محدود رکھنا، اور

۵) جنگ کے متاثرین کا تحفظ کرنا۔[۳۱]

یہ تمام معیارات قرآن اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں موجود ہیں اور مسلمان ماہرین قانون کی جانب سے انہیں مزید واضح کر دیا گیا ہے۔[۳۲]

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بین الاقوامی قانون کی صحت و درستگی کا سوال، جو مغرب میں اب تک حل نہیں ہو سکا، اسلام کے بین الاقوامی قانون میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتا۔ ہیوگو گروشس کے دور سے بیسویں صدی کے وسط تک، مغرب میں بین الاقوامی ضابطہ قانون کے قانونی کردار پر گرما گرم بحث جاری رہی۔ بعض فضلاء اور قانون دانوں کا کہنا تھا کہ بین الاقوامی قانون، حقیقی معنوں میں قانون نہیں ہے۔ بین الاقوامی قانون کے قانونی کردار سے انکار کرنے والوں میں جان آسٹن، ہابس، اور بینتھم سمیت بہت سے لوگ شامل تھے[۳۳]۔ بعض دوسرے ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ علم قانون کا ایک معدوم نقطہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی قانونی طاقت بہت کمزور ہے۔ کچھ دوسرے کہتے ہیں کہ اسے محض مثبت بین الاقوامی اخلاقیات کی حیثیت حاصل ہے چنانچہ بعضوں نے کہا ہے کہ بین الاقوامی قانون سادہ طور پر اخلاقی اقدار کا ایک مجموعہ ہے۔

یہ اسکالر بین الاقوامی قانون کے قانونی کردار کا انکار بالعموم اس لیے کرتے ہیں کیونکہ:

۱) اس کے اصولوں کی تشکیل یا تخلیق کے لیے کوئی مسلمہ ادارہ نہیں ہے،

۲) ان اصولوں کے تحت تنازعات کے تصفیے کے لیے لازمی دائرہ اختیار کے ساتھ عدالتوں کا کوئی سلسلہ مراتب نہیں ہے، اور

۳) ان قوانین کے نفاذ کے لیے کوئی مسلمہ نظام نہیں ہے۔

اس لیے وکلاء اور ماہرین قانون کی ایک معقول تعداد پوچھتی ہے کہ ایک نظام قانون، نیز عدلیہ اور انتظامیہ کی عدم موجودگی میں ان اصولوں یا قواعد کو قانون کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟ اور بین الاقوامی قانون کا جواز کیا ہے جب کہ یہ دانتوں سے محروم ہے اور اپنے آپ کو نافذ کرنے یا اپنا دفاع کرنے کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی اختیار نہیں رکھتا؟

تاہم ماہرین کے دوسرے مکتب فکر کا موقف ہمیشہ یہ رہا ہے کہ بین الاقوامی قانون حقیقی معنوں میں قانون ہے۔

مسلمان قانون دانوں کی طرف سے یہ سوال کبھی نہیں اٹھایا گیا۔ان کے نزدیک مسلم بین الاقوامی قانون اتنا ہی بااختیار ہے جتنا اسلام کا شہری قانون ہے۔فی الحقیقت یہ دونوں قسم کے قوانین اپنا جواز قرآن سے اور اپنا اختیار رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے حاصل کرتے ہیں۔ یہ اسلام کے ایسے دائمی ماخذ ہیں جنہیں مسلمان حکمران اور عوام دونوں یکساں طور پر بااختیار اور واجب التعمیل کردار کا حامل سمجھتے ہیں۔اس لیے مسلمان ماہرین قانون یہ فیصلہ کرنے میں کبھی کسی مشکل سے دوچار نہیں ہوئے کہ کیا اسلام کا بین الاقوامی قانون، باقاعدہ قانون ہے اور کیا یہ اپنے لیے کسی الگ جواز کا حاجت مند نہیں ہے، ہم مسلم بین الاقوامی قانون کی ابتدائی دور کی کسی کتاب میں اس حوالے سے ایسی کوئی متنازع کیفیت نہیں پاتے۔

مغربی بین الاقوامی قانون مغربی اجتماعیتوں کو یورپی یونین جیسے اتحادوں میں ڈھالنے کے لیے جس قسم کے ارتقائی عمل سے آج گزر رہا ہے، مسلم بین الاقوامی قانون مدتوں پہلے اس سے گزر چکا ہے۔ جو نازک سوال وکلاء اور ماہرین قانون مختلف ملکوں بالخصوص مغربی یورپ میں اٹھاتے ہیں وہ یہ ہے کہ کیا یورپی یونین کو منظم کرنے والے قانون اور یورپی پارلیمنٹ کے اس اختیار نے جسے وہ استعمال کرتی ہے۔یورپی قوموں کی اس خودمختاری کو جس کا ان کی جانب سے دعویٰ کیا جاتا ہے۔سبوتاژ کر دیا ہے یا آگے چل کر اس کیفیت کے نتیجے میں وہ اپنی خودمختاری سے محروم ہونے والی ہیں؟ یہ بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا نئی یورپی یونین ایک طرح سے سابقہ چرچ ریاست کا احیاء ہے؟ یہ سوال دونوں قسم کی ریاستوں کے درمیان مشترکہ شہریت، یکساں قانونی نظام، اور اس میں شمولیت کے لیے عیسائی ہونے کی پابندی جیسی نمایاں مماثلتوں کی بناء پر۔ جس کا مظاہرہ ترکی کی یورپی یونین میں شمولیت کے معاملے میں تحفظات کا اظہار کر کے کیا جارہا ہے۔ صورت حال سے متعلق بن گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برطانوی پارلیمنٹ کے بارے میں پہلے ہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ یورپی پارلیمنٹ کے مقابلے میں اپنے اقتدار اور اختیارات سے دستبردار ہوگئی ہے یا کم از کم اس نے یورپی پارلیمنٹ کو اپنے اختیارات میں شریک کرلیا ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ نے اپنے مطلق اقتدار پر جس کا اس کی جانب سے دعویٰ کیا جاتا تھا، سمجھوتہ کرلیا ہے۔ پوری دنیا کے قانونی حلقوں میں یہ سوال زیر بحث ہے۔ برطانوی وکلاء کی طرف سے اس کے جو جوابات دیے گئے ہیں، ان میں اس حقیقت کے باوجود کہ وہ اپنے بعض اختیارات کی یورپی پارلیمنٹ کو منتقلی تسلیم کرچکی ہے، برطانوی پارلیمنٹ کی خودمختاری پر اصرار کیا گیا ہے۔

ایسے سوالات دوسری اور تیسری صدی ہجری کے مسلمان ماہرین قانون کے درمیان بھی اس وقت زیر بحث آئے جب دو یا زیادہ حکومتیں دارالاسلام کے مشترکہ قانون کے تحت، ایک ہی اسلامی علاقے کے حدود کے اندر وجود میں آئیں۔ ہم تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے دارالاسلام کو ایک حد تک موجودہ یورپی یونین کے مانند تصور کرسکتے ہیں، جہاں بڑی حد تک مشترکہ شہریت رائج کردی گئی ہے، اور جہاں بہت سے ایسے شعبے جو پہلے کسی ملک کے اپنے ہی لوگوں تک محدود تھے، انہیں اب، ملکوں کی اپنی شناخت اور کسی حد تک ان کی خودمختاری کی قیمت پر، دوسرے ملکوں کے شہریوں کے لیے بھی کھول دیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی دارالاسلام اور اس کے حدود میں واقع مختلف مسلم حکومتوں کے درمیان بھی، چند امتیازات کے ساتھ، تعلقات کی یہی شکل ہوا کرتی تھی۔

دوسری صدی ہجری میں مسلمان ماہرین قانون کے ہاتھوں پروان چڑھنے اور بعد کے دور کے فضلاء کی جانب سے توسیع پانے والے سیئر کے علم نے کچھ اور معاملات بھی چھیڑے جن پر اب بات کرنا زیادہ موزوں نہیں، تاہم اس زمانے میں یہ بہت برمحل تھے۔ ہر زندہ اور متحرک قانون کا یہی معاملہ ہے۔ ہر قانونی روایت میں نظر آتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، اس کے بعض اجزاء یا تو منسوخ، یا بدلتی ہوئی ضروریات کے سبب غیر متعلق ہوجاتے ہیں۔ جیسے جیسے وقت کے تقاضے تبدیل ہوتے ہیں، قانونی نظام کا داخلی میکانزم از کار رفتہ امور کو قانون کے بنیادی دھارے سے خارج

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے کا کام کرنے لگتا ہے۔ ابتدائی مسلم بین الاقوامی قانون کے بعض امور کے ضمن میں بھی ایسا ہی ہوا۔ مثال کے طور پر، جنگوں میں ہاتھ آنے والے مالِ غنیمت کی تقسیم سے متعلق سوالات نے مسلمان فضلاء کی تقریباً تمام ابتدائی تحریروں میں نمایاں جگہ پائی۔ اس کی وجہ بالعموم یہ تھی کہ ابتدائی صدیوں، خصوصاً پہلی دو یا تین صدیوں میں، مسلمانوں کے پاس باقاعدہ تنخواہ یافتہ افواج نہیں ہوا کرتی تھیں۔ مسلم افواج عموماً ان رضاکاروں پر مشتمل ہوتی تھیں جو فوج میں یا تو اپنے ملک کے دفاع کے لیے شامل ہوتے تھے یا جہاد میں حصہ لینے کی خاطر، تاکہ اللہ کی رضا حاصل کرسکیں جس کا قرآن میں بارہا وعدہ کیا گیا ہے۔

اس صورت حال میں، مسلمان ماہرین قانون کے لیے یہ معاملہ بہت اہم تھا کہ مجاہدین کے درمیان مالِ غنیمت کس طرح تقسیم کیا جانا چاہیے۔ تاہم جب مسلمان حکومتوں نے مختلف علاقوں میں باقاعدہ افواج رکھنے کا بندوبست کرلیا، تو اس معاملے کی اہمیت بڑی حد تک ختم ہوگئی۔

اس موضوع پر کی گئی ابتدائی کاوشوں میں ایسے اور بھی معاملات ملتے ہیں جو آج کے حالات سے متعلق نہیں ہیں لیکن ایسا وقت آسکتا ہے جب وہ ازسرنو اہمیت اختیار کرلیں۔

مسلم بین الاقوامی قانون کی متعدد خصوصیات اسے بین الاقوامی قوانین کے تصورات کی دوسری روایات سے ممتاز کرتی ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مسلم بین الاقوامی قانون ایک جامع نظامِ قانون کا لازمی حصہ ہے۔ یہ جامع قانونی اسکیم متوازن، ہمہ پہلو، ہمہ گیر، اور مسلمان فرد اور مسلمان معاشرے دونوں کی زندگی میں رونما ہونے والی تمام ممکنہ صورتوں کا لحاظ رکھنے والی ہے۔ یہ اسکیم انسانی سوچ، اخلاقی قدروں اور روحانی بنیادوں میں گہرائی تک اپنی جڑیں رکھتی ہے۔ اسلام کا قانونِ اقوام کبھی بھی اخلاقی تقاضوں سے عاری قانونی نظام نہیں رہا۔ اس نے ہمیشہ اپنا قانونی جواز اُن اخلاقی اصولوں سے اور اپنا اعتبار و اختیار، ان مذہبی بنیادوں سے اخذ کیا ہے جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں۔[۳۴]

اسلامی قانون بالکل شروع ہی سے کثیر النسلی اور کثیر الثقافتی قانونی نظام رہا ہے جو ایک تکثیری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاشرے کے لیے ایک عملی اور قابل عمل نمونہ فراہم کرتا ہے۔ انسانی نسلوں اور قانونی آراء کے تنوع میں یہ ایک روحانی۔اخلاقی یگانگت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ اسلام کی عمومی وحدت کے نقشہ کار میں مختلف لوگوں اور قوموں کے تنوع اور ثقافتی آزادی کو بھی برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اسلامی قانون کے دوسرے اجزاء کی طرح مسلم بین الاقوامی قانون بھی قرآن کے تصور عدل پر مبنی ہے، جو حقیقی عدل اور قانونی عدل میں امتیاز کرتا ہے۔ اس لیے پوری انسانی تاریخ میں شاید تنہا شریعت ہی وہ نظام قانون ہے جس نے ریاست، اس کے اعضاء اور مشینری کی جانب سے فراہم کیے جانے والے قانونی انصاف اور افراد کی جانب سے مہیا کیے گئے حقیقی انصاف کے درمیان خط امتیاز کھینچا ہے۔[۳۵] اس کے ساتھ ساتھ یہ بین الاقوامی سودوں اور لین دین کی معاہداتی بنیادوں کو بھی تسلیم کرتا ہے۔[۳۶]

قرآن ایسی آیات سے بھرا ہوا ہے جن میں وعدوں کو پورا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ وہ اہل ایمان سے وعدوں پر قائم رہنے اور یقین دہانیوں کو پورا کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔[۳۷] ان قرآنی احکام کو رسول اللہ کی جانب سے ایک قانونی ضابطے کی شکل دی گئی، جس کی رو سے مسلمانوں کو ان شرائط کی لازماً پابندی کرنی چاہیے جو باہمی اتفاق سے طے پا جائیں۔[۳۸] اس بنیادی قانونی ضابطے کی روشنی میں مسلمان فقہاء نے دوسرے اصول وضع کیے ہیں، جنہیں اب دنیا کی مختلف قانونی روایات میں تسلیم کیا جاتا ہے، اور جو انسانی برادری کے تمام نظام ہائے قانون میں شامل کیے جا چکے ہیں۔ مثال کے طور پر[۳۹] یہ اصول کہ (مفہوم) ''سفیر کی جانب سے عہد شکنی، ریاست کی جانب سے عہد شکنی سمجھی جائے گی۔''[۴۰] اس لیے ریاست کو بحیثیت سفیر بھیجے جانے والے شخص کے قول و عمل کی اس وقت تک مکمل ذمہ داری قبول کرنی چاہیے جب تک وہ اپنے منصب پر کام کرتا رہے۔

بین الاقوامی تعلقات کو مضبوط اخلاقی بنیادوں پر منظم کرنے کے لیے مسلم بین الاقوامی قانون کے اس فیاضانہ حصے، اور اس موضوع پر مسلمان فضلاء کی جانب سے دوسری صدی ہجری سے تخلیق کیے گئے ٹھوس لٹریچر کے باوجود، یہ حقیقت افسوس ناک ہے کہ اگر سب نہیں تو بیشتر ممتاز مغربی اسکالر اس ورثے کا اعتراف کرنے میں قطعی ناکام رہے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اوپن ھیم کی بنیادی اہمیت کی کاوش ''اے ٹریٹیز آف انٹرنیشنل لاء'' سے میں بہت متاثر رہا ہوں اور اس کا مطالعہ دور طالب علمی ہی سے بڑے غور وفکر اور احترام کے ساتھ کرتا رہا ہوں۔ مصنف کی علمیت اور کتاب کی جامعیت میرے لیے انتہائی متاثر کن ثابت ہوئی۔ لیکن مجھے یہ جان کر شدید مایوسی ہوئی کہ اس فاضل دانشور نے بھی بین الاقوامی قانون کے لیے مسلمانوں کے حصے کو نظر انداز کرنے کی راہ کا انتخاب کیا ہے۔ بین الاقوامی قانون کی بنیادوں پر بات کرتے ہوئے اوپن ھیم یونانی تاریخ کا حوالہ دیتا ہے اور پھر رومیوں کی بات کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ ایک ہزار سال سے زیادہ لمبی چھلانگ لگاتا ہے اور جدید مغربی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اس نے مسلمان ماہرین قانون کے کام کا ذکر کرنے کے لیے ایک سطر لکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی ہے، اگرچہ ان کی تحریریں اسے امکانی طور پر جرمن، رومن اور فرنچ تراجم کی شکل میں دستیاب تھیں۔ مواد کی اس دستیابی کے باوجود، اس نے بین الاقوامی قانون کے لیے مسلمانوں کی خدمات کے بارے میں کسی سرسری تبصرے سے بھی گریز کا فیصلہ کیا۔ ایک ہزار سال کی طویل مدت کے حوالے سے۔۔جس میں اس کے بقول بین الاقوامی قانون میں کوئی ارتقاء نہیں ہوا۔اس کا کہنا ہے کہ اس عرصے میں اس ارتقاء کی نہ کوئی گنجائش تھی نہ ضرورت۔[۴۱] اس طرح وہ ایک فقرے میں بین الاقوامی قانون کی تشکیل میں ایک ہزار سال کے خلاء کا جواز پیش کرتا ہے۔

ان تفصیلات سے واضح ہے کہ بین الاقوامی قانون میں مسلمان فقہاء کا حصہ، اپنے دور کے لحاظ سے نہ صرف انتہائی ترقی یافتہ اور اعلیٰ درجے کا تھا بلکہ آج بھی مزید ارتقاء کے لیے ایک ماخذ اور بنیاد کی حیثیت سے موزوں اور برمحل ہے۔ فی الحقیقت، مسلمانوں کے ہاتھوں ایک ہزار سال سے بھی زیادہ مدت پہلے پروان چڑھنے والا بین الاقوامی قانون، اپنے بہت سے کلیدی اصولوں میں، عصر حاضر کے بیان کردہ تحمل ورواداری اور منصفانہ بین الاقوامی معاشرے کے مثالی معیارات کے حصول کے حوالے سے [مغربی قانون کی نسبت] زیادہ قریب تر اور زیادہ قابل عمل ہے۔ لہٰذا اس قیمتی ورثے کی بحالی، صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ تمام معاشروں کے علمائے قانون کے لیے لازمی ہے۔

مسلمان، بالخصوص مسلم دنیا کے قانون کے طلبہ، اپنے مغربی دوستوں کو یہ یاد دلانا پسند کریں گے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ بین الاقوامی معاملات کے قانون کی توسیع اور ایک نئے قانونی فکر کے ارتقاء میں، ثقافتی پس منظر، سماجی اطوار، اخلاقی معیارات، اور مذہبی اعتقادات اور جذبات کا لحاظ رکھا جانا چاہیے جس سے عالمی اجتماعیت کی صورت گری ہوتی ہے۔ایک قانون ان لوگوں کے جذبات اور مثالی معیارات کو نظر انداز نہیں کرسکتا جن پر اسے نافذ کیا جانا ہو۔ایسا قانون زندہ نہیں رہ سکتا جو زمینی حقائق کو ملحوظ نہ رکھے یا ان کا جواب مہیا نہ کرے۔اور زمینی حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ایک چوتھائی سے زیادہ آبادی ایک منفرد ثقافت، مثالی معیارات کا ایک مجموعہ اور جذبات رکھتی ہے۔اس لیے کسی بھی ایسے نظام قانون کو جو اپنے اطلاق میں آفاقی ہونا چاہتا ہو، اسے لازمی طور پر ایک چوتھائی انسانی آبادی کے مثالی معیارات اور جذبات کا لحاظ رکھنا ہوگا۔بین الاقوامی عدالت کا منشور، عدالت سے مطالبہ کرتا ہے کہ محض مغربی نہیں بلکہ تمام قانونی روایات کے ذمہ دار اور اہم ماہرین قانون کی تحریروں کو ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔کسی سوال کا فیصلہ کرنے سے پہلے وہ سب کچھ جو دوسری نمایاں انسانی روایات اور تہذیبوں میں قانونی موضوعات پر لکھا گیا ہے، لازماً نگاہ میں رکھا جانا چاہیے۔کچھ اور نہیں تو اسے مسلم بین الاقوامی قانون کے بارے میں نئی سوچ کے جواز کے لیے کافی ہونا چاہیے۔

اسلام اور مسلمان ماہرین قانون کا کام ایک ہزار برس کی وہ گم شدہ کڑی فراہم کرتا ہے جسے مغربی علمائے قانون کی جانب سے یا تو مواد کی عدم دستیابی یا کسی دوسری سوچ کی بناء پر نظر انداز کردیا گیا ہے۔بہر حال اب اہم کاوشوں کے تراجم کے ذریعے تمام ممتاز مغربی زبانوں میں یہ مواد دستیاب ہے۔اب عالمی اسکالرز کے لیے انسانی تاریخ کے اگر ہزاروں نہیں تو کم از کم سینکڑوں بہترین قانونی دماغوں کے اس کام کو نظر انداز کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تبصرے اور تبادلۂ خیال

مارک لائل گرانٹ[۳۲]: مسلمان علماء نے ایک ہزار سال کی مدت کے دوران میں اسلامی قانون کے ضمن میں نہایت وقیع کام انجام دیا جسے شاید بھلا دیا گیا ہے۔ میں نے کیمبرج یونیورسٹی میں بہت کچھ پڑھا۔ برسلز یونیورسٹی سے ایک پوسٹ گریجویٹ کورس بھی کیا۔ بیرسٹری کا امتحان میں نے لندن کے اِنس آف کورٹ اسکول آف لاء سے دیا۔ لیکن میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس پوری مدت میں کسی نے اسلامی فقہ یا اسلامی علم قانون کا نام تک نہیں لیا۔ میں پورے اعتماد کے ساتھ علمائے اسلام کی دانش کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں جنہوں نے ابتدائی ہجری برسوں ہی میں اسلامی فقہ کی تعبیر وتشریح کا آغاز کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ افراد پر مشتمل غیر ریاستی اداروں کے تصور کے حوالے سے دور رس نگاہ رکھتے تھے جبکہ بین الاقوامی قانون کی مغربی فکر میں یہ چیز نسبتاً دیر سے آئی۔

بین الاقوامی قانون وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں یہ نئی بلندیوں تک پہنچا جب جدید بین الاقوامی قانون کی عمارت میں بڑے اضافے ہوئے، انسانی حقوق اور بین الاقوامی انسانی قانون جیسے نئے تصورات وجود میں آئے اور پوری دنیا میں وسیع پیمانے پر قبول کیے گئے۔ یہ درست ہے کہ موجودہ بین الاقوامی قانون بڑی حد تک اس عطیہ سے ماخوذ ہے جسے آپ یہودی- عیسائی اقدار کہہ سکتے ہیں۔ تاہم یہ مذہبی بنیادوں پر کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بین الاقوامی قانون، تمام قوانین کی طرح، فاتحین کا وضع کردہ ہے، مگر یہ مذہبی عقائد کی بنیاد پر کوئی تفریق یا امتیاز نہیں برتتا۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ مسلمان علماء اور مسلمان بین الاقوامی وکلاء کو آئندہ پچاس برسوں میں بین الاقوامی قانون کے ارتقاء میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنا ہوگا۔ ایسا کرنا اس لیے بہت ضروری ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں انہوں نے اس کی ترقی میں کوئی نمایاں کردار ادا نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا۔ جدید بین الاقوامی قانون میں اسلامی علم قانون کے حصے اوران ہزار برسوں کی دانش اور تجربے سے پہنچنے والے فائدے کو منوانے کے لیے جو آج کی دانشورانہ تاریخ سے غائب معلوم ہوتے ہیں، کام کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال: کیا بین الاقوامی قانون کبھی کوئی ایسا متحرک اور قابل عمل قانونی نظام بن سکا جو انسانیت کو ایک باوقار مستقبل کی ضمانت مہیا کرتا ہو؟ اور کیا آپ کو بین الاقوامی قانون میں مسلمانوں کے کام کے اعتراف کا کوئی امکان نظر آتا ہے؟

ڈاکٹر غازی: صاف گوئی سے عرض ہے کہ انسانیت کو تحفظ، تعاون اور بہبود فراہم کرنے کے حوالے سے میں بین الاقوامی قانون کے کردار سے مایوس نہیں ہوں۔ اس نے مسلمانوں اور دوسری محروم اور کم مراعات یافتہ جمعیتوں کی ایک حد تک دادرسی کی ہے۔ تاہم پوری دنیا میں مختلف انسانی معاشروں کی ضروریات، جذبات اور معیارات سے ہم آہنگی کی خاطر اسے اپنی تعمیر نو اور اپنے دائرے کو وسعت دینے کے لیے وقت درکار ہے۔ تازہ پیش رفت کے نتیجے میں بین الاقوامی قانون کا دائرہ اثر جنگ سے متاثرہ افراد اور بے ریاست معاشروں کے لوگوں کے انسانی حقوق کے تحفظ تک وسیع ہوا ہے۔ یہ حقیقت کہ مختلف بین الاقوامی تنظیمیں غریب اور کمزور لوگوں کی دیکھ بھال کر رہی ہیں بلاشبہ مثبت علامت ہے۔ یہ بین الاقوامی رجحانات بتاتے ہیں کہ انسانی برادری اپنی آئندہ نسلوں کی بہتری کی خاطر مشترکہ بین الاقوامی قانون سازی کے لیے مثبت سمت میں آگے بڑھ رہی ہے۔ امید ہے کہ نیا بین الاقوامی قانون انسانی برادری کے غریب اور کمزور لوگوں کو مدد اور تعاون فراہم کرے گا۔

جہاں تک ہم عصر بین الاقوامی قانون کی ترقی اور توسیع میں مسلمانوں کے حصے کا تعلق ہے تو بعض بین الاقوامی تنظیموں اور اداروں کی طرف سے کم از کم جزوی طور پر اس کا احساس کیا گیا ہے۔ بین الاقوامی عدالت انصاف کی جانب سے اسے ایک قانونی ضرورت قرار دیے جانے کے علاوہ جیسا کہ اس کے چارٹر میں ہے، بین الاقوامی قانون کے متعدد ممتاز وکلاء کی جانب سے اس ضمن میں اعترافات کیے گئے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۹۵۰ء کے عشرے میں بین الاقوامی قانون کی بنیاد کے ارتقاء میں مسلمان فقہاء کے کردار کا مطالعہ کرنے اور اس کی حیثیت اور مرتبے کو پرکھنے کے لیے ہیگ میں ایک کنونشن منعقد ہوا تھا۔ اس کنونشن میں شرکاء کی جانب سے، جن میں بھاری اکثریت نام وَر غیر مسلم وکلاء اور ماہرین قانون کی تھی، ایک متفقہ قرارداد منظور کی گئی تھی۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ مسلم بین الاقوامی قانون، بین الاقوامی انصاف کے تصور اور اصولوں کو پروان چڑھانے میں معاون ہے، اور یہ ایسے اصولوں اور تصورات کا ایک اہم مآخذ ہے۔

اس کے بعد ۱۹۸۱ء اسلامی ملکوں کی تنظیم (او آئی سی) نے کویت میں تیسری اسلامی سربراہ کانفرنس میں او آئی سی کے رکن ملکوں کے لیے اسلامی عدالت انصاف کے قیام کی قرارداد منظور کی تاکہ اس عدالت میں مسلمان ملکوں کے باہمی تنازعات کے فیصلے شریعت کے مطابق کیے جائیں۔ یہ تجویز اب تک رکن ملکوں کی جانب سے تائید اور توثیق کی منتظر ہے۔ جب بھی توثیق ہوگی، یہ عدالت وجود میں آجائے گی۔ ہم امید کرسکتے ہیں کہ ایسی عدالت کی موجودگی، مسلم بین الاقوامی قانون کی توسیع کے عمل کو تیز کرے گی، اور اسے موجودہ حالات سے زیادہ ہم آہنگ بنائے گی۔ نیز اس عدالت کا وجود مسلمان فقہاء کے پچھلے کام کی از سر نو تعبیر و تشریح، جانچ پرکھ اور اسے جدید تقاضوں سے زیادہ مربوط کرنے کا موقع فراہم کرے گا۔

سوال: آپ بعض اوقات مغرب کے بارے میں خوش گمان اور کشادہ دل معلوم ہوتے ہیں، جبکہ بدقسمتی سے مغرب کے موجودہ رویہ نے ایسی کسی خوش گمانی کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مغرب انسانی حقوق جیسے تصورات سے تیسری دنیا کے ملکوں کو اپنے مفادات کی سمت میں ہانکنے کا کام لیتا ہے۔ نئے عالمی نظام کا دارومدار گروپ آف ایٹ، آئی ایم ایف، ورلڈ بینک، اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن پر ہے۔ یہ ایک بالواسطہ حکمرانی ہے جو مقامی آلۂ کار عناصر کے ذریعے کی جاتی ہے اور اس کے صلے میں یہ عناصر مادّی مفادات میں اس وقت تک شریک رہ سکتے ہیں جب تک وہ مغربی آقاؤں کے تابعدار اور خدمت گزار بنے رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں محسوس کرتا ہوں کہ مغرب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یورپی تمدن کو بنیادی اہمیت دیتا ہے اور آج کی تہذیب کو احساس برتری کے ساتھ اسی سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے حالانکہ یہ رویہ آمرانہ اور غیر منصفانہ ہے۔

ڈاکٹر غازی: میں مانتا ہوں اور آپ کے تاثر کی توثیق کرتا ہوں کہ میں اب تک خوش گمان ہوں۔ کشادہ دلی کا تو پتہ نہیں، مگر اپنی پُر امیدی سے میں ضرور باخبر ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن آئے گا ....اور ہم اس سمت میں آگے بڑھ رہے ہیں.... جب ایک مشترکہ انسانی پلیٹ فارم وجود میں آئے گا، جو محروم و مظلوم انسانیت کو انصاف فراہم کرے گا۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو عالم اسلام اور مغربی دنیا کے باہمی تعلقات کے حوالے سے آسان اور سادہ کلیات بنا لیتے ہیں۔ بلاشبہ مغربی ملکوں خصوصاً ان کے دارالحکومتوں میں انفرادی سطح پر ایسے لوگ ہیں جن پر آپ کا تبصرہ پوری طرح چسپاں ہوتا ہے۔ میں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرتا کہ یہ لوگ بہت با اثر ہیں۔ تاہم اگر ہم اپنے تجزیے میں عمومیت پسندی سے کام لیں گے، تو ہم ان کروڑوں افراد کو نظر انداز کر دیں گے جو مسلم دنیا سے کوئی دشمنی یا اس کے خلاف کوئی بری نیت نہیں رکھتے۔ اسلامی اصطلاح استعمال کی جائے تو یہ لوگ امۃ الدعوۃ ہیں۔ ہم انھیں اپنا مستقل دشمن قرار دینے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ وہ ہمارے ہی جیسے انسان ہیں۔ وہ ہمارے ہی جیسے خیالات اور جذبات رکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم مغربی دنیا کے لوگوں کی اکثریت پر اعتبار و اعتماد کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ تعلیم یافتہ ہیں اور انصاف، آزادی، مساوات اور منصفانہ جدوجہد کے حق کی حمایت کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہاں مخصوص مفادات اور خفیہ عزائم اور منصوبے رکھنے والے کچھ لوگ بھی ہیں۔ یہ لوگ ان قوتوں کے حامی و معاون ہیں جن کا مشن مسلمانوں کے خلاف کام کرنا ہے۔ بلاشبہ یہ قوتیں مغربی دنیا کی پالیسیوں اور اقدامات کی صورت گری میں زبردست کردار ادا کر رہی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمیں ایک کٹھن چیلنج سے نمٹنا ہے۔ اگر ہمارے پیغام میں معقولیت اور ہماری پیش کش میں جاذبیت ہے تو ہمیں مدلل، مثبت اور قائل کرنے والے انداز میں تعبیر و تشریح کے ذریعے اہل مغرب کو اسلام سے متعارف کرانے کے لیے لازماً آگے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آنا چاہیے۔ ہدف ان لوگوں کے دلوں کو جیتنا ہونا چاہیے جو مخصوص مفادات رکھنے والوں کے گروہ میں شامل نہیں ہیں، اور کسی بھی گروہ کے نظریات کو انہوں نے دانستہ اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیا ہے۔ اس بات کو تسلیم کیا جانا چاہیے کہ اس کرۂ ارض پر بہت سے لوگ ہماری کوتاہی کے نتیجے میں دوسروں کے زیر اثر ہیں۔ ہم اب تک اسلام کا پیغام اتنے مؤثر اور دل نشین انداز میں اہل مغرب تک نہیں پہنچا سکے جس طرح پہنچانا چاہیے۔

اس لیے میں احترام کے ساتھ آپ سے اختلاف کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز کر کے مغربی دنیا کو بحیثیت مجموعی قابل مذمت قرار نہیں دینا چاہیے۔ ہمیں اس بات کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ بعض لوگ جو سازشوں سے لاعلم ہونے کی وجہ سے مسلم دنیا کے خلاف ہیں وہ حقیقتاً استحصال کا شکار ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ بحیثیت مسلمان بھی ہمیں کسی قوم کو بحیثیت کل قابل مذمت قرار دینے یا کسی قوم کا بحیثیت کل منفی انداز میں ذکر کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ یہ رویہ قرآن اور اسلام کی اخلاقی روایات سے متصادم ہے۔ حتیٰ کہ حکمت عملی کے طور پر بھی ایسا طرز عمل اختیار کرنے کا مشورہ نہیں دیا جا سکتا۔

سوال: بین الاقوامی قانون کے آفاقی اصولوں کی روشنی میں، جو مسلم اور غیر مسلم تمام ملکوں پر یکساں طور پر لاگو ہیں، اسرائیل کو تسلیم کرنے کے معاملے میں آپ کے نزدیک پاکستان کا موقف کیا ہونا چاہیے؟ کیا حکومت پاکستان کو اسرائیل کو تسلیم کر لینا چاہیے؟ کیونکہ سب کچھ کے باوجود یہ بہرحال کوئی مذہبی نہیں بلکہ علاقائی مسئلہ ہے۔

ڈاکٹر غازی: میں سب سے پہلے آپ کو اور اس کے ساتھ ساتھ فاضل صدر نشین [ہائی کمشنر سلطنت متحدہ برطانیہ] کو یہ یاد دلانا چاہوں گا کہ فلسطین کے مسئلے کا دُکھتا زخم ہمارے نوآبادیاتی ماضی کی دردناک باقیات میں سے ہے۔ فلسطینی عشروں سے جن مصائب و آلام کا شکار ہیں وہ استعماری طاقتوں کے فیصلوں کا براہ راست نتیجہ ہیں، اس لیے انہیں لازماً اخلاقی طور پر اس مسئلے کے حل میں مدد دینے کا احساس ہونا چاہیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ پاکستان کو اسرائیل کو تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔ میں اسے کوئی جغرافیائی تنازع یا دو ملکوں کا باہمی جھگڑا تصور نہیں کرتا۔ تاریخ میں اسرائیل کبھی ایک ملک نہیں رہا، کم از کم پچھلے دو ہزار سال میں ایسے کسی ملک کا کوئی وجود نہیں ملتا۔ پچھلی کئی صدیوں کی معلوم تاریخ کی رو سے دنیا کے اس حصے میں آبادی کی اکثریت کبھی یہودی نہیں رہی۔ یہ ملک ہمیشہ صرف فلسطینیوں کا رہا ہے۔ آپ خواہ قومی ریاست کے نظریے پر یقین رکھتے ہوں یا اسلامی ریاست کے تصور پر، ہر صورت میں فلسطین، فلسطینیوں ہی کا ہے۔ اگر ہم قومی ریاست کے قائل ہیں تو فلسطین، فلسطینی قوم کا ہونا چاہیے اور اگر ہم اسلامی ریاست پر یقین رکھتے ہیں تو یہ ملک فلسطینی مسلمانوں کا ہونا چاہیے۔

میں بلا تکلف آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میری یہ رائے کیوں ہے۔ اسرائیل وہ ملک ہے جو فلسطین کے لوگوں کی خواہشات اور جذبات کے بالکل علی الرغم وجود میں لایا گیا۔ مختلف پس منظر رکھنے والے، مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف ثقافتی گروپوں سے تعلق رکھنے والے، مختلف سماجی اور نسلی حالات سے آنے والے بیرونی اور اجنبی لوگ پہلی عالمی جنگ کے فاتحین کی جانب سے کھینچ کھینچ کر ایک جگہ جمع کر دیے گئے۔ کئی دہائیوں تک یہ لوگ نہ تو ایک زبان بول سکتے تھے نہ ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے تھے۔ ان سے ایسی جگہ ایک ملک بنانے کو کہا گیا جس سے وہ کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اس ملک کے اصل باشندوں یعنی فلسطینیوں کو نکال باہر کیا گیا۔ انہیں نہایت وحشیانہ اور بدترین طریقوں سے اذیتیں دی گئیں۔ اور اب انہیں ان لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کا مشورہ دیا جا رہا ہے جو ان پر بدترین مظالم کرتے چلے آ رہے ہیں اور ان مظلوموں سے اپنے ہی وطن میں دوسرے درجے کی اقلیت بن کر رہنے کو کہا جا رہا ہے۔ یہ رویہ بین الاقوامی قانون کے تمام اصولوں کی نفی کرتا ہے۔

ہمیں بہار (بھارت) سے تعلق رکھنے اور بہاری یا بہاری مسلمان کہلانے والے اپنے بھائیوں کے مسئلے سے سابقہ پیش آیا۔ بہار کے بہت سے مسلمانوں نے پاکستان کے قیام کے وقت مشرقی پاکستان میں، جو بعد میں بنگلہ دیش بن گیا، پاکستانی شہریوں کی حیثیت سے پناہ لی تھی۔ سقوط مشرقی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پاکستان کے بعد انہیں بنگلہ دیش کے شہریوں کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا۔ انہوں نے خود بھی بنگلہ دیش کی شہریت قبول نہیں کی۔ لہٰذا وہ آج تک بے گھر اور بے ریاست شہری ہیں، ان کا اپنا کوئی ملک نہیں ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ مختلف ملکوں میں چلے گئے ہیں۔ یہ لوگ پوری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں۔

فرض کیجیے کہ آج کی کوئی عالمی طاقت فیصلہ کرتی ہے کہ کسی ملک کا کوئی حصہ اس کے اصل باشندوں سے لے کر بہاریوں کو دے دیا جانا چاہیے کیونکہ یہ بے چارے مظلوم اور منتشر ہیں، اور یہ علاقہ انہیں ''انسانی'' بنیادوں پر دینے کے لیے اصل باشندوں سے بزورِ قوت حاصل کیا جانا چاہیے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ''انسانی'' بنیادوں پر اسرائیل کی تخلیق کی تائید کرنے والے ملکوں کا کوئی بھی شخص اس بندوبست کی حمایت کرے گا۔ اسی طرح ہم مسلمان بھی سمجھتے ہیں کہ فلسطین کے ایک حصے کو کاٹ کر اسرائیل کا تخلیق کیا جانا اور اسے یہودیوں کے وطن میں تبدیل کر دیا جانا، مسئلے کا جائز اور درست حل نہیں تھا۔ فلسطینی باشندوں پر یہودیوں کے اس طرح مسلط کر دیے جانے کا کوئی اخلاقی اور قانونی جواز نہیں تھا۔

اگر مغرب قومی ریاست کے تصور کی سرپرستی میں مخلص اور سچا ہے اور اگر وہ مذہب کو قومیت کی بنیاد کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا تو دنیا کے مختلف حصوں سے بیس سے تیس لاکھ یہودیوں کو جمع کر کے ایک ایسے علاقے میں بسا دینے کا کوئی جواز نہیں تھا جو ان کا نہیں ہے۔

اسے میری ذاتی رائے سمجھا جا سکتا ہے مگر پوری دنیا کے کروڑوں مسلمان اس میں میرے ساتھ ہیں۔ یہ نقطہ نظر پاکستان کی دینی اور سیاسی ہیئت دونوں میں وراثتاً موجود ہے۔ میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ جب ۱۹۴۰ء میں لاہور میں قرارداد پاکستان منظور کی گئی، تو اسی اجلاس میں، کل ہند مسلم لیگ نے مسئلہ فلسطین پر بھی ایک قرارداد منظور کی تھی جو تقریباً ان ہی خیالات پر مشتمل تھی جن کا میں نے ابھی اظہار کیا ہے۔ میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہمارا قومی موقف ہے۔ یہ ہمارے بانی اکابر کا نقطہ نظر ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میرے نزدیک یہ محض کسی ملک کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا سوال نہیں، یہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور گہری جڑیں رکھنے والا معاملہ ہے۔ یہ مسئلہ تاریخ، بین الاقوامی قانون اور مختلف انسانی جمعیتوں کے حقوق کے حوالے سے سنگین مضمرات کا حامل ہے۔ اگر آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ فلسطینی خود اپنے ملک میں بسنے کا حق نہیں رکھتے تھے، جبکہ یہودی مختلف ملکوں سے جمع ہوکر یہاں آباد ہونے کا حق رکھتے تھے، تو مجھے یقین ہے کہ ایسی دوسری بہت سی مثالیں موجود ہیں جہاں یہی اقدام کیا جانا چاہیے۔

سوال: یہ درست ہے کہ خفیہ محرکات یا مخصوص مفادات کے لیے کام کرنے والی قوتیں بہت کم ہیں، تاہم ان کی طاقت بے پناہ ہے، چنانچہ وہ کسی کی پروا کیے بغیر پورے عالمی منظر کی صورت گری کر رہی ہیں۔ دہرے معیار اور بے انصافی کے اس تناظر میں، جو فرمان امروز ہے، مسلمانوں کی جانب سے پر تشدد ردعمل کو ہم کیسے روک سکتے ہیں جو آپ کے نزدیک شکست خوردہ مایوسی کی علامت ہے۔ دوسرے یہ کہ جب عالمی طاقتیں بین الاقوامی قوانین کو مذاق بنا دیتی ہیں تو کون سی قوت یا طاقت ایسی ہے جو امن اور انصاف کو یقینی بنانے کے لیے ان قوانین کو نافذ کر سکے؟

ڈاکٹر غازی: ان حالات کے باوجود خوش بینی اور پُر امیدی کی بڑی گنجائش ہے کیونکہ دنیا بتدریج اس سمت میں پیش رفت کر رہی ہے جہاں ملکوں کے درمیان بین الاقوامی معاملات کے حوالے سے سوچ بچار میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس فکر کو بڑے پیمانے پر تائید حاصل ہو رہی ہے۔ بین الاقوامی قانون اور متعدد بین الاقوامی ادارے اس مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ انسانی برادری ان کوششوں پر پورے اطمینان کے ساتھ اعتبار کر سکتی ہے۔ بین الاقوامی عدالت انصاف کا وجود میں آنا، بین الاقوامی کریمنل کورٹ کا قائم ہونا اور مختلف ملکوں میں بعض جنگی مجرموں پر مقدمہ چلایا جانا، یقینی طور پر مثبت علامتیں ہیں۔ تاہم لوگوں کو اس کی اہمیت سے آگاہ کرنے، اور اس حوالے سے رائے عامہ کو مطلوبہ حد تک بیدار کرنے کے لیے بہر حال وقت درکار ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ وقت کے کسی لمحے میں وہ مرحلہ آجائے گا جب تنہا قانون طاقتوروں کے ہاتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مروڑنے کے قابل ہوگا۔ محض قانون اس بات کو یقینی بنانے کی اہلیت نہیں رکھتا کہ لوگوں کے حقوق محفوظ ہوں۔ قانون اسی صورت میں مؤثر ہوتا ہے جب قانون نافذ کرنے والے مؤثر ہوں۔ جب قانون نافذ کرنے والے طاقتور اور مؤثر ہوں اور مختلف ملکوں میں ان کے پیچھے مضبوط رائے عامہ موجود ہو، تبھی قانون اپنا کردار مکمل اور نتیجہ خیز طور پر ادا کر سکتا ہے۔ ایک اہم اور مثبت علامت یہ ہے کہ عراق اور افغانستان میں امریکی پالیسی کے خلاف اٹھنے والی آوازیں مسلمان ملکوں کی نسبت مغربی ملکوں میں کہیں زیادہ طاقتور تھیں۔ ہمیں اس مثبت حقیقت کو ماننا چاہیے۔

سوال: مغرب اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات پر ایک مخاصمت کی سی کیفیت طاری نظر آتی ہے۔ اور یہ ''ہم بمقابلہ وہ'' کا طرز فکر بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ ایک طرف مغرب کی جانب سے اسلام کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے سمجھنے میں کھلی ناکامی اِس دشمنی کو جنم دینے کا سبب ہے، جبکہ دوسری طرف مسلم دنیا کی جانب سے موجودہ عالمی ماحول میں مزید نرمی سے کام لینے سے گریز نے صورت حال کو ابتر کر دیا ہے۔ یہ کیفیت اس حقیقت کے باوجود ہے کہ اسلام کو ساری انسانیت کے لیے رحمت قرار دیا گیا ہے۔ بظاہر ان مختلف رویوں میں ہم مطابقت کیسے پیدا کر سکتے ہیں؟

ڈاکٹر غازی: ہمیں بہت سے ایسے مسائل درپیش ہیں جن کا از سر نو جائزہ لینے اور بہتر طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ دراصل مسائل کا جو حل ہم تجویز کرتے ہیں اس میں ایک بنیادی نقص ہے۔ ہمیں معاملے کے بنیادی پہلو پر توجہ دینی چاہیے۔ بنیادی ضرورت یہ ہے کہ انسانیت ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر متحد ہو، اس کے پاس اصول وضوابط اور معیارات کا ایک متفقہ مجموعہ ہو جس کا اطلاق ہر ایک پر ہوتا ہو۔ پھر ان ضوابط اور معیارات کو رائے عامہ کی جانب سے مضبوط حمایت اور پشت پناہی حاصل ہو۔ اسی صورت میں یہ چھوٹے چھوٹے، فروعی اور ثانوی اہمیت کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم بنیادی معاملے کی طرف توجہ دیے بغیر ضمنی جھگڑوں ہی میں الجھے رہے تو ہم ناقابل حل بحران میں پھنسے رہیں گے اور اس منحوس چکر سے کبھی باہر نہیں آسکیں گے۔

سوال: میری فکرمندی مشرق وسطیٰ، ایشیا اور یورپ کی بہت سی یونیورسٹیوں کی تعلیمی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پالیسیوں کے حوالے سے ہے۔ قانون کے طلبہ جب قانون پڑھتے ہیں، تو انہیں کئی مضامین پڑھنے ہوتے ہیں مثلاً سیاسی قانون، بین الاقوامی قانون، ریاستی بین الاقوامی قانون، تجارتی قانون وغیرہ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کی بہت سی یونیورسٹیوں میں اسلامی قانون اور اسلامی علم قانون خصوصی طور پر متعارف نہیں کرایا گیا ہے۔ آپ کی رائے میں اس کی کیا وجہ ہے کہ اسلامی یا شرعی قانون اب تک علمی حلقوں میں اعتبار حاصل نہیں کرسکا؟ کیا او آئی سی اس ضمن میں کوئی کردار ادا کرسکتی ہے؟

ڈاکٹر غازی: سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ معاملہ او آئی سی کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ او آئی سی کا کام رکن ملکوں کے لیے تعلیمی پالیسی وضع کرنا نہیں۔ تاہم یہ ادارہ رکن ملکوں کی توجہ شرعی قانون کے مطالعہ اور تدریس کی اہمیت کی جانب مبذول کراسکتا ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، اس کی جانب سے یہ کام کیا بھی گیا ہے۔ او آئی سی نے باقاعدہ ایک کمیٹی بنائی تھی اور اسے دیوانی اُمور اور معاملات کے لیے ایک ضابطہ کی تیاری کا کام سونپا گیا تھا تاکہ مختلف مسلمان ملکوں میں اس پر عمل کیا جائے۔ ممتاز اسلامی ماہر قانون اور دانش ور شیخ مصطفیٰ احمد زرقا (۱۹۰۴۔۱۹۹۹) اس کمیٹی کے سربراہ تھے۔ مجھے بھی ان کے ساتھ کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ انہوں نے رکن ممالک کے غور و خوض کے لیے چند قانونی تجاویز مرتب کی تھیں۔ ان کی بعض تجاویز بعض ملکوں میں اپنائی بھی گئی تھیں اور ان ملکوں کی آئینی دستاویزات میں بھی شامل کی گئی تھیں۔

جہاں تک قانون شریعت کی گریجویشن کی سطح تک تدریس کی بات ہے تو مسلمان ملکوں میں ایسی سیکڑوں قانونی درسگاہیں ہیں جہاں اسلامی قانون گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ دونوں مدارج تک پڑھایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض مغربی ملکوں میں بھی قانون کی اعلیٰ تعلیم کے ایسے مراکز اور اسکول بھی ہیں جن میں اسلامی قانون گریجویٹ اور ماسٹرز کے ساتھ ساتھ ڈاکٹریٹ کی سطح تک پڑھایا جاتا ہے۔ ہارورڈ میں اسلامی قانونی مطالعات کے لیے ایک مرکز قائم ہے جہاں ماسٹرز اور پی ایچ ڈی کی سطح تک کورسز کا بندوبست ہے اور متعدد مسلمان طالب علم وہاں پڑھ رہے ہیں۔ کئی دوسرے مغربی ملکوں میں بھی اسی طرح اسلامی قانون نصاب کی مختلف سطحوں تک پڑھایا جارہا ہے۔ بعض ادارے اسلامی قانون میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علاحدہ سند دیتے ہیں، جبکہ دوسری جگہوں پر یہ سند کے ایک جزوی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سلسلہ مختلف ملکوں میں جاری ہے۔ قانونی نصاب میں زیادہ سے زیادہ اسلامی قوانین کی شمولیت کا رجحان بڑھ رہا ہے، اور مغرب و مشرق دونوں میں نئی یونیورسٹیاں اس سمت میں پیش قدمی کر رہی ہیں۔ نئے ادارے بھی اس صف میں شامل ہو رہے ہیں جہاں اسلامی قانون پڑھایا جا رہا ہے۔

(ترجمہ: ثروت جمال اصمعی)

......................حواشی......................

۱: مختلف اسکالرز نے قانون کے مثبت نظریے کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی تشریح کی ہے۔ بین الاقوامی قانون سے اس کے تعلق کو جاننے کے لیے دیکھیے:

Starke, "Introduction to International Law", 20-24

۲: قدیم ہندوستانی فلسفیوں کے نظریات کے لیے دیکھیے:

Kapoor and Tandan, "International Law".

۳: دوسری کاوشوں کے ساتھ دیکھیے:

Nussbaum, "Concise History of the Law of Nations".

۴: جَس جینٹیم (jus gentium)، یعنی قانونِ اقوام، رومی قانون کی ایک اصطلاح تھی۔ یہ جدید مفہوم میں بین الاقوامی قانون کے مساوی نہیں ہے۔ اس کے بجائے اس کا مطلب ہے شہری قانون کے برعکس، یعنی وہ قوانین جو قدیم زمانے کی مہذب قوموں کی جانب سے تسلیم کیے گئے۔ باقاعدہ بین الاقوامی قانون کی عدم موجودگی میں بین الاقوامی معاملات میں جَس جینٹیم پر انحصار کیا جاتا تھا۔

۵: اوپن ھیم (Oppenheim)، ۲۰۰۸، ص ۸۷: ''...اپنی ابتداء ہی سے جدید بین الاقوامی قانون اس تقاضے سے مغلوب رہا کہ اسے بڑی حد تک مغربی یورپی عیسائی تہذیب کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضروریات کی تکمیل کرنی ہے---''

۶: حمید اللہ، ''قانون بین الممالک کے اصول اور نظائر''، ص ۳۰۔

۷: بحوالہ حمید اللہ، ایضاً

on the authority of Nys, "Les Origines du Droit Internaional".

۸: بین الاقوامی قانون میں فرد کو بحیثیت موضوع تسلیم کیے جانے پر مختصر بحث کے لیے دیکھیے:

Levy, "Contemprary International Law", 72-74

۹: ایضاً، ص ۶۹-۷۰

۱۰: ایضاً

۱۱: دیکھیے Dixon, "Textbook on International Law", 325

۱۲: مثال کے لیے دیکھیے:

Joshi, "International Law and Human Rights", 304-372

۱۳: دیکھیے PCIJ Sev. A. 9 (1927): 4-33 ff

۱۴: ڈکسن، ایضاً، ص ۳۲۵

۱۵: بین الاقوامی انسان دوست قانون متعدد بین الاقوامی معاہدوں اور میثاقوں کے ذریعے بتدریج ارتقاء پذیر ہوا ہے، ان میں اب تک سب سے آخری جنیوا کنونشن اور ھیگ کنونشن ہے، جن پر انیسویں اور بیسویں صدی میں دستخط ہوئے۔ یہ پورا قانون اب ۱۲ اگست ۱۹۴۹ء کے چار بخوبی معروف جنیوا کنونشنز میں موجود ہے۔

۱۶: مثال کے طور پر دیکھیے، القرآن، البقرہ ۲: ۲۱، النساء ۴: ۱، الحجرات ۴۹: ۱۳، وغیرہ۔

۱۷: مثال کے طور پر دیکھیے، القرآن، الاعراف ۷: ۲۶، ۲۷، ۳۵، وغیرہ۔

۱۸: عیسائیوں کی بعض اچھی صفات کے حوالے کے لیے دیکھیے، القرآن، المائدہ ۵: ۸۲-۸۳۔

۱۹: ترمذی، الجامی، کتاب العلم، ۱۹; ابن ماجہ، السنن، کتاب الزہد، ۱۵۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۰: اس اتحاد کی تفصیلات دوسروں کے ساتھ ساتھ ابن ہشام نے بھی اپنی سیرت النبیؐ میں محفوظ کی ہیں۔

۲۱: دیکھیے: اسٹارک، انٹروڈکشن ٹو انٹرنیشنل لاء۔

۲۲: ''اہل کتاب'' ایک اصطلاح ہے جو قرآن میں ان لوگوں کی نشان دہی کے لیے بکثرت استعمال کی گئی ہے جو کسی آسمانی کتاب یا کسی ایسے مذہب کے حامل ہیں جو فی الاصل آسمانی ہے۔ خاص طور پر یہ یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے مستعمل ہے۔

۲۳: القرآن ۳:۶۴

۲۴: حمیداللہ، مسلم کنڈکٹ آف اسٹیٹ، ص ۱۴

۲۵: مثال کے طور پر دیکھیے: القرآن، البقرہ ۲:۶۲، المائدہ ۵:۶۹، الحج ۲۲:۱۷۔

۲۶: مثال کے طور پر دیکھئے، القرآن، التوبہ ۹:۴-۵، ۷؛ النساء ۴:۹۰، ۹۱؛ وغیرہ

۲۷: اسی مقصد کے لیے اسلام کے دور اول کے علماء کی جانب سے سیر اور مغازی کا علم پروان چڑھایا اور منضبط کیا گیا تھا۔ موازنے کے لیے دیکھیے: حمیداللہ، ایضاً، باب دوم۔

۲۸: دیکھیے:

Ghazi, "Introduction to al-Shaibani's al-Siyar al-Saghir, 7-17

۲۹: ایسی بعض تفصیلات کے لیے دیکھیے: غازی، خطبات بھاولپور، ۱۵۴-۱۶۳۔

۳۰: عربیک، ایم ایس، نمبر ۱۱۵۶، لالے لی کلیکشن۔

۳۱: جدید بین الاقوامی انسانیت دوست قانون بھی اسی مقدمے پر مبنی ہے کہ اس کا اصل مقصد جنگ کے متاثرین کا تحفظ ہے۔

۳۲: تفصیلات کے لیے دیکھیے:

Zemmali, *Combattants et Prisonnier de Guerre en Droit Islamique et en Droit International Humanitaire*

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۳: دیکھیے Starke, "Introduction to International Law", 18 ff

۳۴: تفصیلی مباحث کے لیے دیکھیے: حمید اللہ، ایضاً، ۴۷-۷۶۔

۳۵: غازی *State and Lagislation in Islam*,92-94

۳۶: اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ قرآن ذمہ داریوں اور وعدوں کی تکمیل پر زور دیتا ہے، مثال کے طور پر، القرآن، الانفال، ۸:۵۵-۵۶; التوبہ ۹:۴، ۷; وغیرہ۔

۳۷: القرآن، الانفال ۸:۵۵-۵۶، التوبہ ۹:۴; وغیرہ۔

۳۸: روایت ابوداؤد، ترمذی، احمد، اور حاکم۔

۳۹: یہ کلیہ امام شافعی کے الفاظ پر مبنی ہے جو دوسری صدی ہجری کے مشہور اور ممتاز فقیہ تھے۔

۴۰: السرخسی، شرح السیر الکبیر، ۲۹۷۔

Oppenheim's International Law, Edited by Lauterpacht, 7:۴۱

۴۲: مارک لائل گرانٹ نے پاکستان میں برطانیہ کے سفیر کی حیثیت سے ۲۰۰۳ء سے ۲۰۰۶ء تک خدمات انجام دیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتابیات

Abu Daud Sulayman al-Ashath. Kitab as-Sunan.

Ahmad (Imam), al-Musnad, six volumes.

Al-Sarakhsi. Sharh al-Siyar al-Kabir. Vol. I. Hyderabad Deccan: Da'irat al-Ma'arif.

Dixon, Martin. 2000. Textbook on International Law. London.

Ghazi, Mahmood. 1998. Introduction to al-Shaibani's al-Siyar al-Saghir. Islamabad: Islamic Research Institute.

---. 2006. State and Legislation in Islam. Islamabad: Shariah Academy.

---. 2007. Khutbat-i-Bahawalpur. Islamabad: Shariah Academy.

Hakim (Muhammad ibn 'Abd Allah al-Hakim). 1334-41AH. Al-Mustadrak 'ala 's-Sahihayn fi 'l-Hadith. Hyderabad: Da'irat al-Ma'arif.

Hamidullah, Muhammad. 1364AH. Qanun Bayn al-Mamalik Ke Usul Awr Naziren. Hyderabad Deccan:

---. 1987. Muslim Conduct of State. Lahore: Sheikh Muhammad Ashraf Publishers.

Ibn Hisham ('Abd al-Malik ibn Hisham). (d. 243AH.) Sirat an-Nabi.

Ibn Majah (Muhammad ibn Yazid ibn Majah al Qawzini). (d. 273 or 275AH.) Kitab as-Sunan.

Joshi, K.C. 2006. International Law and Human Rights. Part II. Lucknow:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

Eastern Book Academy.

Kapoor and Tandan. 1980. International Law. Lahore: Mansoor Book House.

Laleli collection, No. 1156 Arabic MSS, now preserved in Sulemaniye, along with 113 other collections.

Levy, Werner. 1991. Contemporary International Law. Colorado: West view Press Inc.

Nussbaun, A. 1954. A Concise History of the Law of Nations. Edinburgh.

Nys, E. 1894. Les Origines du Droit International. Bruxelles:

Oppenheim, L. 1958. Oppenheim's International Law. Edited by Hersch Lauterpacht.

---. 2003. Oppenheim's International Law. Vol. I - Peace, edited by Sir Robert Jennings and Sir Arthur Watts. Indiana:

Starke, J.G. 1972. An Introduction to International Law. London: Butterworth and Company.

---. 1992. Introduction to International Law. Lahore.

Suhaili, al-Rawd al-Unuf, in loco.

Tirmidhi (Muhammad ibn Isa at-Tirmidhi). (d. 275 or 279 AH.) Al-Jami as-Sahih. Several Editions.

Zemmali, Ameur. 1997. Combattants et Prisonniers de Guerre en Droit Islamique et en Droit International Humanitaire. Paris: Editions A. Pedone.

© rasailojaraid.com